تفسیر آیات الاحکام

چند بنیادی مباحث

حافظ طاہر اسلام عسکری ☆

زیر نظر تحریر کے دو حصے ہیں۔ حصہ اوّل میں قرآن حکیم کی تفسیر سے متعلق کچھ اصولی نکات کی توضیح ہوگی، جبکہ دوسرے حصے میں آیات الاحکام اور ان کی تفسیر کے بارے میں چند گزارشات پیش کی جائیں گی۔ واللّٰہ المُستعان۔

✌ تفسیر قرآن سے متعلق چند اصولی نکات کی وضاحت

یہاں اصول تفسیر کے حوالے سے کوئی تفصیلی گفتگو پیش نظر نہیں، بلکہ صرف انہی پہلوؤں کا تذکرہ مقصود ہے جن میں افراط وتفریط کا رویہ اپنایا گیا ہے، جس سے کلامِ الٰہی کی تفسیر کے سلسلے میں مختلف فتنوں نے جنم لیا ہے۔

(۱) تفسیر قرآن میں حدیث وسنت کا مقام

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اس کلام سے مرادِ الٰہی کو واضح کرنا تفسیر کہلاتا ہے۔ مطالعۂ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظِ قرآن کی تفسیر، شرح اور وضاحت، جسے اصطلاحِ قرآنی میں 'بیان' کہا گیا ہے، بھی خود خدا کے ذمہ ہے۔ فرمایا:

﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝﴾ (القیٰمة) ''پھر اس کا واضح کر دینا ہمارے ذمہ ہے۔''

اس کی وجہ بالکل واضح ہے کہ کسی کلام کا حقیقی مدعا صحیح معنوں میں خود متکلم ہی واضح کر سکتا ہے۔ پھر قرآن سے ایک اور حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ قرآن کا یہ بیان قرآن سے الگ ہے اور خدا نے اپنے نمائندے کے ذریعے کیا ہے۔ چنانچہ پیغمبر خدا سیدنا محمد ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

☆ شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی لاہور

﴿ وَاَنْزَلْنَـآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (النحل)

''ہم نے یہ ذکر آپؐ پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپؐ لوگوں کے لیے اس شے کو کھول کھول کر بیان فرمادیں جو اُن کی طرف اتاری گئی' شاید کہ وہ غور وفکر کریں۔''

اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ اس ذمہ داری کو رسولِ مکرم ﷺ نے بتمام وکمال پورا کیا اور الفاظ قرآن کے علاوہ اس کا ''بیان'' بھی اُمت تک پہنچایا۔ اسی آیت کی بنیاد پر اہل علم نے کہا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام j کو جس طرح قرآن مجید کے الفاظ سکھائے اسی طرح اس کے معانی بھی سکھائے۔[1] لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ بیان رسول اکرم ﷺ اپنے پاس سے گھڑ کر لوگوں تک پہنچاتے تھے' بلکہ یہ بھی خدا کی طرف سے عطا کردہ تھا۔ اسی لیے آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ)) [2]

''آگاہ رہو کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا مثل بھی (یعنی حدیث وسنت)''۔ ☆

چنانچہ حدیث وسنت کا یہ سارا ذخیرہ دراصل قرآن کا وہی بیان ہے جو وحی کی صورت میں آپؐ پر نازل فرمایا گیا اور قرآن وسنت ایک ہی روشنی کی دو کرنیں ہیں۔ علمائے سلف نے بھی اس امر کی وضاحت کی ہے کہ قرآن کریم کی طرح حدیث وسنت بھی منزل من اللہ ہے۔ امام اوزاعیؒ حسان بن عطیہؒ سے بیان روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: **كان جبريل ينزل على رسول اللهﷺ بالسنة كما ينزل عليه بالقرآن ويعلمه السنة كما يعلمه القرآن**[3] یعنی ''جبریلؑ جس طرح رسول اکرم ﷺ کے پاس قرآن مجید لے کر نازل ہوتے تھے اسی طرح سنت لے کر اترتے تھے۔ اور قرآن کی طرح سنت کی بھی تعلیم دیتے تھے''۔ قرآن مجید اور سنت رسولؐ کا یہ تعلق اتنا مستحکم اور مضبوط ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((لَنْ يَّتَفَرَّقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ))[4]

''یہ دونوں علیحدہ نہیں ہوں گے' یہاں تک کہ حوض کوثر میں مجھ پر پیش ہوں۔''

عصر حاضر میں ''تفسیر قرآن'' کے سلسلہ میں جو فتنے نظر آتے ہیں ان کی اصل جڑ یہی ہے کہ حدیث وسنت کو وحی تسلیم نہیں کیا جاتا اور وحی کو صرف قرآن ہی میں محصور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا دلائل اس کی

☆ اس حدیث پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ قرآن کی رو سے تو اس کا کوئی مثل ہو ہی نہیں سکتا: ﴿لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ﴾ (الاسراء:۸۸) لیکن یہ بات کم فہمی پر مبنی ہے۔ مثلیت کے کئی پہلو ہیں۔ معجزہ ہونے کے اعتبار سے تو اس کا کوئی مثل نہیں' لیکن صحت اور سند ہونے کے اعتبار سے حدیث قرآن کی مثل ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝﴾ (الشوریٰ) اور دوسری طرف انسان کے بارے میں فرمایا: ﴿فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝﴾ (الدھر) اب اللہ بھی سمیع وبصیر ہے اور انسان بھی' لیکن اس کے باوجود اللہ کا کوئی مثل بھی نہیں۔ (مضمون نگار)

بھرپور تردید کرتے ہیں۔

چنانچہ کچھ لوگ تو حدیث وسنت کی صحت کے سرے سے ہی منکر ہیں اور رسول اکرم ﷺ کو محض ایک ڈاکیا سمجھتے ہیں کہ آپؐ اُمت کو الفاظِ قرآن دے گئے اور بس‘ آپؐ کی ذمہ داری ختم۔ ان کے نزدیک قرآن مجید کے مجملات کی توضیح اور عمومات کی تخصیص ''مرکز ملت'' کے سپرد ہے‘ یا پھر کوئی مفکر قرآن اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں ''معارفِ قرآن'' بیان کرے گا‘ لغت عرب کے ذریعے لوگوں کو ''مطالبِ فرقان'' سمجھائے گا اور ''روایات وآثار'' کے بجائے اپنی خداداد فہم و ذہانت سے ''مفہوم القرآن'' کی وضاحت کرے گا۔ اس طرزِ فکر کو سورۃ النحل کی آیت ۴۴ مکمل طور پر مسترد کرتی ہے‘ جہاں تبیین قرآن کو نزولِ قرآن کا مقصودِ اصلی اور آپ ﷺ کی بنیادی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔

ایک دوسرا گروہ وہ ہے جو بعض اعتبارات سے پہلے گروہ سے زیادہ خطرناک ہے‘ کیونکہ وہ حدیث و سنت کے اتھارٹی ہونے کا علی الاعلان منکر تو نہیں‘ لیکن وہ اسے وحی ماننے پر بھی تیار نہیں۔ مزید برآں اس نے حدیث وسنت میں ایک نیا فرق بھی ایجاد کر لیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے جس عمل پر اُمت کا صریح اجماع یا عملی تواتر مل جائے وہ تو سنت ہے اور قابل اعتبار ہے‘ لیکن حدیث کی یہ حیثیت نہیں‘ لہٰذا وہ اس قابل نہیں کہ اسے تفسیر قرآن کے قطعی ماخذوں میں شامل کیا جا سکے‘ لیکن اس گروہ کے مطابق ذاتی فہم کی بنا پر سمجھا گیا نظم قرآن اور ادب جاہلی قرآن کی تفسیر کے قطعی مآخذ ہیں!! اسی طرزِ فکر کی بنا پر وہ احادیث کو یا تو خلافِ قرآن کہہ کر ردّ کر دیتے ہیں یا پھر ان کی عجیب وغریب تأویلات کر کے ان کے اصل مفہوم ہی کو بدل دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث وسنت کا یہ فرق اہل فن سے ثابت ہی نہیں۔ اس سے رسول اکرم ﷺ کے وہ سارے افعال واقوال سنت سے خارج ہو جاتے ہیں جن کو تواتر عملی حاصل نہ ہو سکا اور سنتوں کی تعداد سکڑ کر بہت کم رہ جاتی ہے۔ پھر یہ امر بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ حدیث کا قرآن کے مخالف ہونا امر محال ہے‘ اس لیے یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو سنت کے منزل من اللہ ہونے کا انکاری ہو۔ جلیل القدر تابعی سیدنا سعید بن جبیرؒ نے ایک مرتبہ کوئی حدیث بیان کی تو کسی نے کہہ دیا کہ یہ تو قرآن کے خلاف ہے‘ تو انہوں نے اس پر اظہارِ ناپسندیدگی کرتے ہوئے کہا کہ رسول معظم ﷺ تجھ سے زیادہ قرآن جانتے تھے۔(۵)

المختصر قرآن مجید کی تفسیر کا اوّلین اور بنیادی مأخذ سنت رسول ہے اور اس کے بغیر تفسیر قرآن ناممکن ہے۔ بلکہ سلف صالحینؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ **القرآن احوج الی السنة من السنة الی القرآن**(۶) یعنی ''قرآن مجید اپنی وضاحت میں جس قدر سنت کا محتاج ہے‘ سنت کے مطالب کی وضاحت کے لیے قرآن کی اتنی ضرورت نہیں''۔ اور امام یحییٰ بن ابی کثیرؒ فرماتے ہیں کہ **السنة قاضية على الكتاب**(۷) یعنی ''سنت قرآن مجید کے مطالب ومعانی کے سلسلہ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے''۔ ☆ بنابریں حدیث و

☆ بعض اہل علم نے اس اندازِ تعبیر کو مناسب نہیں سمجھا (جیسے امام احمد بن حنبلؒ)۔ لیکن اس کا اصل مقصود ◀◀

سنت سے استفادہ اور رسول اکرم ﷺ کے بیان کردہ مفاہیم قرآن کو قطعی و حتمی سمجھنا خود ایمان بالقرآن کا لازمی تقاضا بھی ہے اور تفسیر قرآن کا صحیح طریقہ بھی۔

(۲) تفسیر قرآن اور صحابہ کرام j کے آثار واقوال

قرآن مجید کی درست تفسیر اور صحیح فہم حاصل کرنے کے لیے صحابہ کرام j کے اقوال و آثار سے رہنمائی بھی ازبس ضروری ہے۔ اس کی بنیادی طور پر دو وجوہات ہیں:

پہلی یہ کہ قرآن مجید صحابہ کرامؓ کے سامنے نازل ہوتا تھا اور خود انہی کے احوال وظروف کے مطابق اُترتا تھا' اس لیے وہ اس کے پس منظر سے بخوبی آگاہ اور واقف تھے اور اس کے مفاہیم ومعانی کو صحیح طور پر سمجھتے تھے۔ لہٰذا آیاتِ قرآنی کے جو مطالب صحابہ کرامؓ نے بیان فرمائے ہیں ان کو تسلیم کرنا لازم ہے' کیونکہ کسی بھی کلام کے پس منظر سے آگاہی اس کے حصولِ فہم کا بنیادی ترین اصول ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ:

وحینئذ اذا لم نجد التفسیر فی القرآن ولا فی السنة رجعنا فی ذلک الی اقوال الصحابة فانهم ادری بذلک لما شاهدوه من القرآن والاحوال التی اختصوا بها ومالهم من الفهم التام والعلم الصحیح والعمل الصالح(۸)

''جب ہمیں کسی آیت کی تفسیر قرآن یا صحیح روایت سے معلوم نہ ہو سکے تو پھر ہمیں صحابہ کرامؓ کے اقوال پر غور کرنا چاہیے' کیونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ فلاں آیت کس موقع پر اور کیوں نازل ہوئی۔ مزید برآں وہ مکمل فہم' صحیح علم اور نیک اعمال جیسے خصائص کے حامل تھے۔''

یہی بات رأس المفسرین علامہ ابن کثیرؒ نے کہی ہے کہ:

''صحابہ کرامؓ اُس وقت کے قرائن واحوال سے آگاہ ہونے کی بنا پر قرآن ہم سے زیادہ سمجھتے تھے' ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم' علم صحیح اور عمل صالح سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا''۔(۹)

دوسری یہ کہ قرآن مجید درحقیقت صحابہ کرام j کی زبان میں نازل ہوا اور وہی اس کے اوّلین مخاطب تھے۔ بنا بریں یہ قرآن مجید کے عربی مبین اور فصیح و بلیغ ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ صحابہ کرامؓ اس

◀◀ سامنے رہے تو یہ بالکل درست ہے کہ الفاظ قرآن بسا اوقات ایک سے زائد احتمالات کے حامل ہوتے ہیں' تو وہاں سنت مرادِ الٰہی کا تعین کر دیتی ہے' جیسے ''قَرْءٌ''۔ اس کے معنی حیض کے بھی ہیں اور طہر کے بھی۔ اب سنت نے فیصلہ کر دیا کہ یہاں حیض مراد ہے۔ بعض لوگ اس قول کی آڑ میں علمائے سلفؒ کو مطعون ٹھہراتے ہیں کہ وہ روایات کو قرآن پر ترجیح دیتے تھے' حالانکہ حجت ہونے کے اعتبار سے سنت (بشرطِ ثبوت وصحت) اور قرآن میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح حاصل نہیں' بلکہ دونوں کا ایک ہی مقام ومرتبہ ہے کیونکہ دونوں ہی وحی ہیں' البتہ الفاظِ الٰہی ہونے کی بنا پر قرآن کو خصوصی شرف وفضیلت حاصل ہے۔ (مضمون نگار)

کے مقصود و منشاء کو درست طور پر سمجھ لیتے۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے کما حقہ سمجھا۔ لہٰذا تفسیر قرآن میں ان کے بیان کردہ معانی کو قبول کرنا واجب اور ان کی خلاف ورزی کرنا صریح ضلالت ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ ملحوظِ نظر رہنا چاہیے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں اگر صحابیؓ کا قول ذاتی اجتہاد و استنباط پر مبنی ہے اور اس سے نزول آیت کا پس منظر یا کسی لفظ کی لغوی وضاحت پر مقصود نہیں تو اس صورت میں اس سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، خصوصاً جب دیگر صحابہؓ کا اس سے اختلاف بھی منقول ہو۔ واللہ اعلم!

(۳) تفسیر قرآن میں شانِ نزول کی اہمیت

شانِ نزول یا اسبابِ نزول سے مراد یہ ہے کہ ان اسباب و وجوہ کا علم ہو جو قرآنی آیات کے نزول کا باعث بنیں، یعنی زمانۂ نزول قرآن کا پس منظر معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر ظاہر ہے کہ الفاظ قرآن کا صحیح مدعا سمجھنا بہت مشکل بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے اور آیت کے اصل مفہوم تک رسائی نہیں ہو پاتی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ:

معرفة سبب النزول تعين على فهم الآية فان العلم بالسبب يورث العلم بالمسبب(۱۰)

''سبب نزول کی معرفت آیت کے سمجھنے میں معاون ہے، کیونکہ سبب کا علم مسبب تک پہنچا دیتا ہے''۔

اسبابِ نزول کی اہمیت کے پیش نظر علماء نے اس کو مستقل فن کی حیثیت دی ہے اور اس پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اسباب نزول کے سلسلہ میں افراط و تفریط کا رویہ پایا جاتا ہے۔ بعض اسے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں تو بعض تفسیر قرآن کے لیے اسے لازم قرار دیتے ہیں۔ اس کی صحیح حیثیت جاننے کے لیے معلوم ہونا چاہیے کہ اسباب نزول کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم وہ ہے جس کی طرف خود آیات میں اشارہ پایا جاتا ہے، مثلاً مغازی یا دیگر واقعات، کہ جب تک ان کی تفصیل سامنے نہ ہو مذکورہ جزئیات ذہن نشین نہیں ہو سکتیں۔ اس کا جاننا تو ہر مفسر کے لیے ضروری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض علماء نے جو یہ کہا کہ اسبابِ نزول کی معرفت کے بغیر قرآن کی تفسیر نہیں ہو سکتی، اس سے مراد یہی قسم ہے۔

چنانچہ اس قسم کے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ کسی نے شانِ نزول کو مدنظر رکھے بغیر آیت کی غلط تفسیر بیان کر دی تو صحابہؓ نے اس کی تصحیح کی۔ بطورِ مثال ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

اسلامی لشکر رومیوں کی ایک عظیم الشان فوج سے معرکہ آراء تھا کہ ایک مجاہد نے تن تنہا رومی لشکر پر حملہ کر دیا اور ان کی صفوں میں گھس گیا۔ اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ اس نے تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا، جبکہ قرآن میں ہے کہ ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرۃ:۱۹۵) یعنی ''اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''۔ صحابیٔ رسول سیدنا ابوایوب انصاریؓ کو علم ہوا تو فرمایا کہ اس آیت کا یہ مفہوم درست نہیں، بلکہ یہ آیت تو ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی کہ جب اسلام کو شان و شوکت حاصل ہو گئی اور یہ

مضبوط ہوگیا تو ہم نے سوچا کہ اب ہماری مدد کی خاص ضرورت نہیں رہی' لہٰذا جہاد میں مصروفیت کی بنا پر ہمارے کاروبار اور جائیداد کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کریں اور جہاد چھوڑ دیں' تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جہاد کو چھوڑ کر کاروبارِ زندگی میں مشغول ہوجانا ہلاکت ہے' اس سے بچو۔(۱۱)

اس قسم کا سبب نزول اگر صحابیؓ سے مروی ہو تو اس کو مرفوع حدیث سمجھا جائے گا' کیونکہ اس میں صحابہ کے اجتہاد کو دخل نہیں ہوتا۔ امام حاکمؒ لکھتے ہیں:

واذا اخبر الصحابی الّذی یشهد الّذی شهد الوحی والتنزیل عن آیة من القرآن انها نزلت فی کذا' فانه حدیث مسند ومشی علی هذا ابن الصلاح(۱۲)

''جب کوئی صحابی جو نزولِ وحی یا آیت کے وقت موجود تھا' قرآن کی کسی آیت کے بارے میں خبر دے کہ یہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی تو یہ بھی حدیث مرفوع ہے۔ ابن الصلاحؒ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے''۔

سبب نزول کی دوسری قسم یہ ہے کہ صحابہؓ یا تابعینؒ کسی آیت کے تحت یہ کہیں کہ **نزلت فی کذا** یا **انزل اللّٰه فی کذا**' یعنی یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی۔ اس قسم کے بارے میں حجۃ الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

وقد ذکر المفسرون تلک الحادثة بقصد الاحاطة بالآثار المناسبة للآیة او بقصد بیان ما صدق علیه المعصوم ولیس هذا القسم من الضروریات ..... وکان غرضهم تصویر ما صدقت علیه الآیة(۱۳)

''بسا اوقات مفسرین آیت کے تحت کوئی واقعہ اس مقصد سے ذکر کر دیتے ہیں کہ اس آیت سے مناسبت رکھنے والے واقعات جمع ہوجائیں' یا جس امر کا عموم تصدیق کر رہا ہو اُس کی وضاحت مقصود ہوتی ہے۔ یہ قسم ضروری اسبابِ نزول سے نہیں ہے..... اور اس سے ان کا مقصد اس امر کی تصویر کشی کرنا ہوتا ہے جس پر آیت صادق آسکتی ہے''۔

بہرحال شانِ نزول کی یہ قسم بنیادی اہمیت کی حامل نہیں۔ سلف دراصل یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ واقعہ یا مسئلہ بھی اس آیت کے تحت داخل ہے' ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں' لیکن یہ فائدے سے بھی خالی نہیں' لہٰذا اس کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ اسبابِ نزول کے سلسلہ میں معتدل رویہ یہ ہے کہ ایسی روایات کی سند کی مکمل تحقیق اور چھان بین کے بعد ہی انہیں قبول کرنا چاہیے۔ نہ تو بالکل نظر انداز کرنا مناسب ہے اور نہ ہی ضعیف و بے سند روایات کی بنا پر ہر آیت یا ہر سورت کا شانِ نزول بیان کرنا علمی طریق ہے۔

ایک اور پہلو جس کا ذکر اسبابِ نزول کے ضمن میں ضروری ہے' یہ ہے کہ آیت کے کسی خاص سبب نزول کے ہونے کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ اس آیت کا حکم اس واقعہ یا شخص سے خاص ہے' بلکہ جہاں بھی وہ نوعیت پائی جائے گی اسی حکم کا اعتبار ہوگا۔ اصول تفسیر کا مسلّمہ قاعدہ ہے کہ ''**العبرة بعموم اللفظ لا**

بخصوص السبب'' یعنی ''اعتبار لفظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ سبب کے خصوص کا۔'' شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

قصرعمومات القرآن علی اسباب نزولها باطل فان عامة الآیات نزلت باسباب اقتضت ذلک وقد علم ان شیئا منها لم یقصر علی سببه[۱۴]

''عموم قرآن کو اسبابِ نزول پر محدود کر دینا باطل ہے' کیونکہ اکثر آیات ایسے اسباب کے تحت نازل ہوئی ہیں جو اس کے مقتضی تھے' جبکہ یہ معلوم ہے کہ کوئی آیت بھی اپنے سبب نزول تک محدود نہیں ہے''۔

(۴) تفسیر قرآن میں کتب سابقہ اور اسرائیلیات کا مقام

قرآن مجید میں پہلی اُمتوں بالخصوص بنی اسرائیل کا مختلف پہلوؤں سے ذکر کیا گیا ہے' اور ان کے تذکرے سے جو اصل مقصود ہے (یعنی تذکیر و نصیحت اور عبرت پذیری) وہ آیاتِ قرآنی سے بخوبی حاصل ہو جاتا ہے۔ تاہم بہت سے واقعات کی تفصیلات و جزئیات تورات و انجیل اور اسرائیلی روایات سے حاصل ہو جاتی ہیں جن سے کئی مفید نکات حاصل ہوتے ہیں اور علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

تورات اور انجیل میں اگرچہ بہت زیادہ تغیرات ہو چکے ہیں اور ان کے ماننے والوں نے اس میں تحریف و تبدل کر دیا ہے' لیکن قرآن مجید اور سنت رسول کے بیان کردہ حقائق کو حتمی خیال کرتے ہوئے ایسی جزئیات جو کتاب و سنت سے متصادم نہ ہوں' تورات و انجیل سے لی جا سکتی ہیں۔ یہی معاملہ ''اسرائیلیات'' کا ہے۔ ان سے مراد وہ روایات ہیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہونے والے صحابہؓ یا تابعینؒ سے مروی ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی ہے لیکن ان کی تصدیق یا تکذیب سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((اِذَا حَدَّثَکُمْ اَهْلُ الْکِتَابِ فَلَا تُصَدِّقُوْهُمْ وَلَا تُکَذِّبُوْهُمْ))[۱۵]

''جب تمہیں اہل کتاب کوئی واقعہ ذکر کریں تو اس کی تصدیق نہ کرو اور نہ اس کو جھٹلاؤ''۔

یہ اس لیے فرمایا کہ مبادا وہ تمہیں سچی خبر دے رہے ہوں تو تم ان کو جھٹلا دو اور ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں غلط خبر دے رہے ہوں اور تم ان کی تصدیق کر بیٹھو۔ لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب قرآن و سنت اس معاملے میں خاموش ہوں اور اس کی صریح تصدیق یا تردید موجود نہ ہو۔

اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے صحابہ کرامؓ میں سے سیدنا ابو ہریرہؓ' سیدنا ابن عباس اور سیدنا عبداللہ ابن عمرو بن عاص j نے اہل کتاب کی روایات لی ہیں۔[۱۶] لیکن زمانۂ تابعین میں اس معاملے میں کوتاہی ہوئی اور اسرائیلیات کے نام پر ہر قسم کا رطب و یابس جمع ہو گیا جو آج تک کتب تفسیر میں موجود ہے اور بعض متساہل مفسرین اس کو بیان کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ ایک غیر مناسب رجحان ہے جس سے

احتراز ضروری ہے۔ بلکہ بعض روایات تو ایسی ہیں جن سے انبیاء کرام f کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی قسم کے بارے میں شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ:

اِنَّ النقل عن بنی اسرائیل دسیسة دخلت فی دیننا.....(۱۷)

''بنی اسرائیل سے روایت کرنا ایسا پوشیدہ فریب ہے جو ہمارے دین میں داخل ہو چکا ہے.....''

بعض لوگ اسرائیلی روایات پر تو شدید تنقید کرتے ہیں' لیکن کتب سابقہ (تورات وانجیل وغیرہ) سے ایسی چیزوں کو حلال کرنے کی سعی میں مصروف ہیں جو اسلامی احکامات کی روشنی میں قطعاً حرام ہیں' اور شرائع سابقہ کی روشنی میں کتاب وسنت کی نصوص کی ایسی تشریحات کر رہے ہیں جو اُمت مسلمہ کے اجتماعی تعامل سے قطعی بیگانہ اور بالکل برعکس ہیں۔ تماثیل اور موسیقی کی حلت کے لیے پہلی شریعتوں کے حوالے اسی رویے کی عکاسی کرتے ہیں' باوجودیکہ یہ ملت اسلامیہ کا اجماعی موقف ہے کہ ہماری شریعت نے سابقہ شرائع کی بے شمار حلال چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔

(۵) تفسیر قرآن میں عربی لغت وادب کا مقام

کسی بھی متکلم کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس کی زبان سے گہری واقفیت حاصل ہونا ایسا مسلّمہ اُصول ہے جس سے کسی طور بھی انکار نہیں کیا جا سکتا' لہٰذا قرآن مجید کے مفہوم ومدعا تک رسائی کے لیے عربی زبان وادب سے شناسائی از بس ضروری ہے' اور عربی زبان وادب کا علم ہونا ایک مفسر کے لیے ناگزیر ہے۔

صحابہ کرام j بھی قرآن فہمی کے سلسلہ میں اہل عرب کی لغت اور ان کے محاورات سے مدد لیا کرتے تھے۔ سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ:

الشعر دیوان العرب فاذا لعاجم علینا شیءٌ من القرآن رجعنا الیه (الاتقان)

''شعر اہل عرب کا دیوان ہے' جب ہمیں کوئی لفظ اجنبی معلوم ہوتا تو ہم اس کی طرف رجوع کرتے۔''

اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لغتِ عرب کا علم فہم قرآن میں معاون ہے' وہیں اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ اس ضمن میں وہی لغت معتبر ہوگی جو زمانۂ نزولِ قرآن میں رائج تھی نہ کہ بعد میں بولی جانے والی عربی زبان' جس میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ لغت سے الفاظِ قرآن کا مفہوم متعین کرنا اسی صورت میں درست سمجھا جائے گا جب وہ احادیثِ رسولؐ' اقوال صحابہؓ اور سلف صالحینؒ کے طے کردہ متفقہ اور اجماعی مفہوم کے مخالف نہ ہو۔ افسوس ہے کہ اس معاملے میں بھی افراط وتفریط کے پہلو موجود ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو محض تراجم پڑھ کر قرآن کی تفسیر کرنے کی جسارت کی جا رہی ہے جبکہ دوسری طرف لغت وادب ہی کو تفسیر قرآن کا اصل مصدر وماخذ سمجھا جاتا ہے اور لغت عرب یا ادب جاہلی کی بنا پر سمجھے گئے مفہوم کو حدیث وسنت کے مقابلے میں ترجیح دی جاتی ہے۔ جو مفہوم اپنی خود ساختہ ''لغات القرآن'' سے ثابت ہو جائے وہی مقصودِ قرآن قرار پاتا ہے اور اس ہستی کے ارشادات وفرامین کو ''روایات'' کہہ کر

نظرانداز کر دیا جاتا ہے جس کے قلبِ اطہر پر قرآن نازل ہوا تھا۔ کچھ لوگ جاہلی شعراء کے کلام سے اخذ کردہ مفاہیم کو اتنا قطعی سمجھتے ہیں کہ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ اُمت کے تمام اہل علم اس کے برعکس موقف رکھتے ہیں' اپنے دریافت شدہ مطالب ہی کو درست قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل قطعی غلط اور تعبیر کلام کے مسلّمہ اصولوں سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے' اس لیے کہ جب خود متکلم اپنی بات کا کوئی مفہوم متعین کر دے تو اس کی خلاف ورزی کسی صورت میں نہیں کی جا سکتی۔ دیگر ماخذوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے لغت و ادب پر زیادہ زور دراصل اہل بدعت نے دیا ہے' تاکہ اپنے خودساختہ نظریات کو قرآن سے کشید کیا جا سکے' ورنہ یہ کوئی ایسا مرجع نہیں کہ محض اسی پر اعتماد کرتے ہوئے کسی آیت کا درست مفہوم متعین کیا جا سکے۔ البتہ مفرد الفاظ کے سلسلے میں لغت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ امام المفسرین علامہ ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں:

> ''مفرداتِ قرآن کے معانی معلوم کرنے کے لیے تو لغت کی طرف رجوع ہو سکتا ہے' مگر کسی آیت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لیے بہرحال وحیٔ الٰہی اور سنت کی طرف رجوع کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔'' (۱۸)

اگر محض لغت کی بنا پر قرآن مجید کو سمجھنا ممکن ہوتا تو کم از کم صحابہ کرام j کو اس سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی اور وہ رسول اکرم ﷺ کی طرف رجوع نہ کرتے۔ ایسی بہت سی مرویات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ بسا اوقات آیاتِ قرآنی کا صحیح منشا سمجھ نہ پاتے اور نبی مکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر استفسار کرتے۔ بطور مثال ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود h فرماتے ہیں کہ جب سورۃ الانعام کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ ۝﴾ تو صحابہؓ پر بہت گراں گزری (کیونکہ انہوں نے ظلم کو اس کے عام معنی معصیت یا زیادتی پر محمول کیا) تو رسول معظم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کبھی ظلم نہ کیا ہو؟ آپؐ نے انہیں سمجھایا کہ یہاں ظلم کا لفظ اپنے خاص مفہوم یعنی شرک کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ سورۂ لقمان میں آیا ہے کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ بیٹا کبھی شرک نہ کرنا' کیونکہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے: ﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝﴾ (لقمٰن) (۱۹)

یہی وجہ ہے کہ لغت و محاورات سے استفادہ کرنے والے اور لغوی تشریحات کے لیے شواہد تک کو چھان مارنے والے معتزلہ نے بھی عقل پرست ہونے کے باوجود اپنی تفاسیر میں سنت اور اقوالِ صحابہؓ سے مدد لی ہے' جیسا کہ علامہ زمخشری معتزلی کی تفسیر ''الکشاف'' میں یہ انداز انتہائی نمایاں نظر آتا ہے۔

المختصر نہ تو عربی زبان سے نابلد رہ کر کسی کو قرآن کی تفسیر کرنے کا حق ہے اور نہ ہی لغت عرب اور

ادب جاہلی سے حاصل شدہ معانی کو احادیثِ رسولؐ آثارِ صحابہؓ اور اسلاف کے متفقہ فہم پر ترجیح دی جاسکتی ہے' بلکہ معاملہ اس کے بین بین ہے۔

(۶) تفسیر بالرائے

الفاظِ قرآن سے خدا تعالیٰ کی حقیقی مراد کیا ہے' اس باب میں قطعیت کا درجہ مخلوق میں سے صرف اور صرف ارشاداتِ پیغمبر معصوم ﷺ کو حاصل ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرامؓ کی تفسیر (اگر مبنی بر اجتہاد نہ ہو) ہے جو کہ حدیث ہی میں داخل ہے اور پھر آیاتِ قرآنی کا وہ متفقہ مفہوم جس پر سلف سے خلف تک سب کا اجماع ہے' کیونکہ از روئے حدیث اُمت بھی بحیثیت مجموعی خطا پر جمع نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ کسی شے کو یقینی ہونے کا شرف حاصل نہیں۔ اور بنظر غائر دیکھا جائے تو قرآن مجید کا اصل مقصود و مدعا اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے اور اُمت مسلمہ کے پاس محفوظ شکل میں موجود ہے۔ لیکن فطرتِ انسانی میں تحقیق و اکتشاف اور انکشاف و جستجو کا جذبہ اسے ہر لحظہ نئے نئے پہلوؤں اور متنوع جہات کے بارے میں غور و فکر پر ابھارتا رہتا ہے۔ یہی معاملہ کلامِ الٰہی پر تدبر و تفکر کے معاملے میں پیش آتا ہے۔ تو کیا تفسیری منقولات پر اکتفا کرتے ہوئے انسان اپنے اس فطری جذبے سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کسی قسم کا نظریہ و تصور پیش نہ کرے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے' کیونکہ اسلام انسان کے تمام تر فطری داعیات کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتا ہے اور انہیں صحیح رُخ عطا کرتا ہے۔ چنانچہ اگر قرآنِ مجید میں غور و فکر سے کسی پر حکمت کے در کھلتے' الجھے ہوئے مسائل کی گتھیاں سلجھتی اور معانی کے کسی نئے جہان تک رسائی ہوتی ہے تو اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں کہ ''اس سے علماء کبھی سیراب نہ ہوں گے.....اور اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے''۔ (۲۰)

پس قرآن مجید میں تفکر و تدبر کے ذریعے مفاہیم و مطالب کے نئے رُخ تلاش کرنا' قرآن اور آیاتِ قرآنی سے نئے نئے پہلو اُجاگر کرنا تفسیر بالرائے کہلاتا ہے۔ یعنی اس کی بنیاد نقل و روایت پر نہ ہو بلکہ استنباط و اجتہاد پر ہو' لیکن ہر قسم کی تفسیر بالرائے قابل قبول نہیں' بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے۔

☆ اگر تو تفسیر قرآن کی مناسب استعداد اور پختہ علم کے ساتھ سلف صالحینؒ کے طریق پر کاربند رہتے ہوئے قرآن مجید سے اکتسابِ فیض کیا جائے اور اس سے نئے عقدے کھولے جائیں تو یہ امر مستحسن ہوگا اور اسے **تفسیر بالرأی المحمود** کہیں گے۔

☆ لیکن اگر اس کے برعکس بغیر ضروری استعداد حاصل کیے اور منہج سلف سے روگردانی کرتے ہوئے اپنی خواہشات یا ذاتی افکار و نظریات کی روشنی میں کوئی نیا تصور یا فکر برآمد کر لی جائے تو یہ طرزِ عمل قابل مذمت ہے اور اسی کو **تفسیر بالرأی المذموم** کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں رسول معظم ﷺ نے سخت وعید بیان فرمائی ہے کہ:

((مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهٖ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ))(۲۱)

''جو قرآن مجید کے بارے میں اپنی رائے سے کوئی بات کہتا ہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔''

یہی وعید اُس شخص کے بارے میں بھی ہے جو بغیر علم کے قرآن میں گفتگو کرتا ہے۔(۲۲) حدیث کے مطابق تو ایسا شخص بھی غلطی کا مرتکب ہے جو محض رائے سے قرآن میں کچھ کہے' خواہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔(۲۳) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

فاما تفسير القرآن بمجرد الرأى فحرام(۲٤)

''محض رائے سے من گھڑت تفسیر کرنا حرام ہے''۔

شیخ الاسلامؒ نے اپنے ''مقدمہ اصول التفسیر'' میں صحابہؓ وسلفؒ سے درجن سے زائد روایات نقل کی ہیں کہ وہ تفسیر بالرائے کو ناپسند سمجھتے تھے اور تفسیر کے سلسلہ میں انتہائی محتاط رویہ اپناتے تھے۔ان میں سے چند اقوال درج ذیل ہیں:

☆ شعبہؒ کی روایت ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق h نے فرمایا: ''کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اگر کتاب اللہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں؟''

☆ ابن جریرؒ سے مروی ہے کہ ''سیدنا ابن عباس i سے ایک ایسی آیت کے بارے میں سوال کیا گیا کہ اگر تم میں سے کسی سے کیا جاتا تو ضرور جواب دیتا' مگر ابن عباسؓ نے کچھ کہنے سے صاف انکار کر دیا''۔

☆ یزید بن ابی یزیدؒ کہتے ہیں کہ ''ہم سعید بن میبّبؒ (عظیم تابعی) سے حلال وحرام کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے' اس چیز کا انہیں سب سے زیادہ علم تھا' لیکن جب ہم کسی آیت کی تفسیر دریافت کرتے تو اس طرح چپ ہو جاتے گویا سنا ہی نہیں''۔

☆ ابراہیمؒ کہتے ہیں: ''ہمارے اساتذہ تفسیر کرنے سے بچتے اور ڈرتے تھے''۔

☆ سیدنا مسروقؒ فرمایا کرتے تھے: ''تفسیر کرنے سے بچو اور ڈرو' کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے روایت ہے''۔(۲۵)

یہ تھا ہمارے اسلافؒ کا طریقہ کار! لیکن اس کے برعکس آج دیکھئے کہ ہر شخص ''مفکر قرآن'' کے منصب پر فائز نظر آتا ہے اور اپنی خود ساختہ ''لغات القرآن'' کی روشنی میں اپنے من پسند افکار وآراء کو قرآن سے کشید کر کے اسے مرادِ الٰہی باور کرا رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے قرآن میں تدبر کے اپنے خود ساختہ اصول مقرر کر رکھے ہیں' جن میں احادیثِ رسولؐ اور آثارِ صحابہؓ تو ظنیت کے درجے میں ہیں' لیکن ادب جاہلی اور ذاتی ایجاد شدہ نظم قرآن مرتبۂ قطعیت پر فائز ہیں۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ ان اصولوں کی روشنی میں قرآنی آیات کے ایسے مطالب پیش کیے جا رہے ہیں جو ڈیڑھ ہزار برس سے ملت اسلامیہ میں بلا اختلاف ونزاع متفقہ اور مسلّمہ طور پر رائج عقائد واعمال سے صریحاً متصادم ہیں۔ یہ ساری کاوشیں

دراصل ''تفسیر بالرأی المذموم'' میں داخل ہیں۔ بالکل سچ فرمایا تھا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے کہ ''جو بھی سلف کے طریق سے ہٹ کر تفسیر کرتا ہے وہ گویا بدعات کا دروازہ کھولتا ہے''۔(۲۶)

تفسیر آیاتُ الاحکام: ایک تعارف

آیات الاحکام اوران کی تفسیر کے سلسلے میں چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

(۱) 'آیات الاحکام' سے مراد

عمومی طور پر ''آیات الاحکام'' میں وہ تمام آیات شامل ہیں جو شرعی احکام بیان کرتی ہیں یا ان پر دلالت کرتی ہیں' خواہ وہ احکام عقائد سے متعلق ہوں یا عملی وفرعی معاملات ☆ سے' اور چاہے ان کا تعلق اخلاقیات وروحانیات سے ہو۔ لیکن اہل علم نے احکام القرآن کا اطلاق صرف عملی وفرعی یعنی فقہی احکام پر کیا ہے۔ چنانچہ جب مطلق طور پر ''آیات الاحکام'' کہا جائے تو اس سے مراد ہوں گی: ''وہ آیات جو احکامِ فقہیہ کو بیان کرتی ہیں اور از روئے نص یا استنباط ان پر دلالت کرتی ہیں''۔(۲۷)

''تفسیر آیات الاحکام'' یا ''فقہی تفسیر'' وہ کہلاتی ہے جس میں:

☆ اصول وفروع میں احکامِ شرعیہ کی تقسیم سے مراد دو امور لیے جاتے ہیں' جن میں سے ایک تو درست ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں' لیکن دوسرا غلط ہے اور اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

قابل قبول تقسیم یہ ہے کہ غلبہ کے اعتبار سے یا توضیح وتشریح کے لیے معاملات کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے کہ یہ اصولی مسائل ہیں اور یہ فرعی۔ یہ تقسیم کوئی زیادہ دقیق یا منضبط نہیں' کیونکہ یہ ضروری ہے کہ اعتقادی مسائل پر عمل کی بنیاد رکھی جائے اور وسیع تر مفہوم میں اخلاق وسلوک کے معاملات اسی میں شامل ہیں۔ دوسری طرف عملی' فقہی اور فرعی مسائل بھی کسی ارادہ' نیت یا عقیدہ ہی کی بنیاد پر سرزد ہوتے ہیں۔ گویا ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ پھر یہ دیکھئے کہ کئی ایسے مسائل ہیں جنہیں ''اصول'' میں شمار کیا جاتا ہے' لیکن ایک مسلمان کے لیے ان سے ناواقف رہنا عذر شمار ہوتا ہے' بلکہ ان کو سیکھنا واجب ہی نہیں سمجھا جاتا۔ جبکہ کچھ معاملات جو شامل تو ''فروع'' میں ہوتے ہیں لیکن وہ ضروریاتِ دین میں شمار ہوتے ہیں اور ہر مسلمان پر حتمی طور پر فرض ولازم ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز' روزہ اور زکوٰۃ جیسے فرائض۔ المختصر اس پہلو سے یہ ایک اصطلاحی تقسیم ہے اور قاعدہ ہے کہ ''**لامشاحة فی الاصطلاح**'' یعنی ''اصطلاح میں کوئی جھگڑا نہیں جب تک خرابی کا ڈر نہ ہو''۔ اور یہاں ایسا کوئی اندیشہ نہیں۔

جہاں تک دوسری تقسیم کا تعلق ہے' جو کہ قابل ردّ ہے' وہ یہ ہے کہ فرعی مسائل کو ہلکا سمجھا جائے یا تکفیر اور بدعتی قرار دینے میں اس کا اعتبار کیا جائے کہ جس نے مسائل اصول میں غلطی کی وہ کافر یا بدعتی ہے' لیکن فرعی مسائل میں ایسا نہیں' تو یہ بات غلط ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس پر سخت تنقید کی ہے۔ دیکھئے: (ا) الثبات والشمول' ص ٦١۔ (ب) التفریق بین الاصول والفروع' للشتری' ١٩٦ /١۔ (ج) منهج القرآن فی تقریر الاحکام' ص ٧٤۔١٣٢۔

''فقہی احکام کو بیان اوران پر تنبیہ کرنے کا التزام کیا گیا ہو' خواہ اس میں صرف اسی پر اکتفا کیا گیا ہو یا (دیگر آیات کے ساتھ) احکام فقہیہ پر خصوصی توجہ دی گئی ہو''۔(۲۸)

حاصل یہ کہ ''تفسیر آیات الاحکام'' میں عقیدہ' تاریخ یا دیگر موضوعات سے متعلقہ آیات کے بجائے صرف فقہی احکام پر مشتمل قرآنی آیات کی تفسیر کی جاتی ہے۔

(۲) ''آیات الاحکام'' کی تعداد

یہ نکتہ علماء کے مابین اختلافی ہے کہ آیا ''آیات الاحکام'' ایک خاص عدد تک محدود ہیں یا نہیں۔اس سلسلے میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں:

☆ **پہلا قول** : پہلا موقف یہ ہے کہ احکام سے متعلقہ آیات محدود ہیں اور ایک عدد معین میں محصور ہیں۔(۲۹) پھر اس قول کے قائلین کا ان کی تعداد میں اختلاف ہے۔چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ یہ پانچ سو ہیں اور کچھ کے نزدیک ان کی تعداد دو صد ہے۔علامہ نواب صدیق حسن خانؒ لکھتے ہیں:

وقد قیل انها خمس مائة آیة ' وما صح ذلک ' وانما هی مائتا آیة او قریب من ذلک وان عدلنا عنه وجعلنا الآیة کل جملة مفیدة یصح ان تسمی کلامًا فی عرف النحاة ' کانت اکثر من خمس مائة آیة(۳۰)

''یہ بھی کہا گیا ہے کہ احکام کی آیتیں پانچ سو ہیں' لیکن یہ درست نہیں' ان کی تعداد دو سو یا اس کے قریب ہے۔اگر ہم اس سے تجاوز کرتے ہوئے ہر اُس مفید جملے کو آیت قرار دیں جسے اہل نحو کی اصطلاح میں ''کلام'' کہا جاتا ہے تو یہ پانچ سو سے زیادہ ہو جائیں گی''۔

حضرت نواب صاحبؒ کے نزدیک یہی درست ہے' اسی لیے مندرجہ بالا عبارت کے بعد لکھا ہے:

وهذا القرآن من شک فیه فلیعد ''اور یہ قرآن ہے' جسے شک ہو وہ شمار کر لے''۔

بعض نے یہ تعداد ڈیڑھ صد بتائی ہے۔

☆**دوسرا قول** :''آیات الاحکام'' کے عدد کے بارے میں دوسرا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ یہ کسی مخصوص عدد میں محدود نہیں ہیں اور قرآن مجید کی ہر آیت سے ایک حکم مستنبط ہوتا ہے۔یہ ملکہ اسے حاصل ہوتا ہے جس پر خدا تعالیٰ قرآن مجید کے مفاہیم ومطالب کے دروازے کھول دے' جو صفائے روح میں ممتاز ہو اور قوتِ استنباط' جودتِ ذہن اور فہم رسا کی خوبیوں سے مالا مال ہو۔(۳۱)

اکثر اہل علم نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ان میں عز بن عبدالسلام' قرافی' طوفی' زرکشی' ابن جزی' سیوطی' ابن النجار' شوکانی اور شنقیطی رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر علماء شامل ہیں۔(۳۲)

علامہ نجم الدین الطّوفی اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

والصحیح ان هذا التقدیر غیر معتبر ' وان مقدار ادلة الاحکام فی ذلک غیر

منحصر ، فان احکام الشرع کما تستنبط من الاوامر والنواھی ، کذلک تستنبط من الاقاصیص والمواعیظ ونحوھا، فقل آیة فی القرآن الکریم الا ویستنبط منھا شیء من الاحکام، واذا اردت تحقیق ھذا فانظر الی کتاب 'ادلة الاحکام'[۳۳] **للشیخ عز الدین بن عبدالسلام، وکأن ھؤلاء الذین حصروھا فی خمس مائةآیة انما نظروا الی ما قصد عن بیان الحکم دون ما استفید منه، ولم یقصد به بیانھا**[۳۴]

''صحیح بات یہ ہے کہ یہ حد بندی قابل اعتبار نہیں اور ادلۃ الاحکام کی مقدار اسی عدد تک محدود نہیں۔ اس لیے کہ احکام شریعت جس طرح اوامر ونواہی سے مستنبط کیے جاتے ہیں اسی طرح قصص ومواعظ سے بھی ان کا استنباط ہوتا ہے۔ قرآن کی بہت ہی تھوڑی آیتیں ہوں گی جن سے کوئی حکم مستنبط نہ ہوتا ہو۔ اگر اس مسئلہ کی مزید تحقیق مقصود ہو تو علامہ عز الدین بن عبدالسلام کی کتاب ''**ادلة الاحکام**'' کی طرف رجوع کیجیے۔ گویا جن علماء نے آیاتِ احکام کو پانچ سو تک محدود کیا انہوں نے اس میں بیانِ حکم کے سلسلے میں یہ دیکھنے کے بجائے کہ آیت سے کیا مستفید ہوتا ہے، صرف اس چیز پر نظر رکھی جو اس میں بیان حکم کے سلسلہ میں مقصود تھی، حالانکہ وہ مقصود نہیں تھی''۔

اسی نکتے کی توضیح میں علامہ قرافیؒ فرماتے ہیں:

فلا تکاد تجد آیة الا وفیھا حکم، وحصرھا فی خمس مائة آیة بعید[۳۵]

''آپ کو کوئی ایسی آیت نہ ملے گی جس میں کوئی حکم نہ ہو اور آیاتِ احکام کو پانچ صد تک محدود کر دینا امر بعید ہے''۔

اس موقف کی ترجیح پر استدلال یوں کیا گیا ہے کہ:

''قرآن مجید میں احکام کی دو قسمیں ہیں''۔ [۳۶] ایک قسم ان احکام کی ہے جن کا ذکر صراحت سے کیا گیا ہے اور یہ بہت ہیں، جیسے: ﴿**کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ**﴾ (البقرۃ:۱۸۳)۔ احکام القرآن عمومی طور پر اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً سورۃ البقرۃ، النساء اور المائدۃ کے غالب احکام اسی نوعیت کے ہیں۔ قرآنی احکام کی دوسری قسم وہ ہے جو غور وفکر اور استنباط سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ احکام پھر مزید دو قسموں میں منقسم ہیں:

(**۱**) وہ احکام جو ایک آیت سے براہِ راست، بغیر کسی دوسری آیت ملائے اخذ کر لیے جاتے ہیں، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے ''حرمت استمنا'' کا حکم مستنبط کیا گیا ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ (المؤمنون)

''اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، مگر اپنی بیویوں یا اپنی کنیزوں سے جو اُن کی

ملکیت میں ہیں' کیونکہ ان پر کوئی ملامت نہیں۔ پس جو اس کے سوا کچھ اور چاہے سو یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

اسی طرح آیت مبارکہ:

﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

''سو اب ان سے مباشرت کیا کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اسے طلب کیا کرو' اور کھاؤ اور پیو حتیٰ کہ تمہارے لیے فجر کے وقت سفید دھاری سیاہ دھاری سے صاف ظاہر ہو جائے۔''

سے یہ مسئلہ اخذ کرنا کہ اگر حالت جنابت میں روزہ رکھ لیا اور طلوع فجر کے بعد غسل کر لیا تو روزہ درست ہوگا۔

(۲) استدلال کے طریق سے ماخوذ احکام کی دوسری قسم یہ ہے کہ کسی آیت کو دوسری آیت یا حدیث سے ملا کر اس سے کسی حکم کا استنباط کیا جائے۔ جیسا کہ سیدنا علی[۳۷] اور سیدنا ابن عباس j[۳۸] نے قرآن سے استدلال کر کے فرمایا ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے کہ:

﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ (الاحقاف:۱۵)

''اور اس کا حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہیں۔''

اور دوسرے مقام پر ہے کہ:

﴿وَفِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾(لقمٰن:۱۴) ''اور اس کا دودھ چھڑانا ہے دو سال میں''۔

حمل اور دودھ چھڑانے کی کل مدت تیس ماہ ہیں' اگر ان میں سے دودھ چھڑانے کے دو سال منہا کر دیے جائیں تو باقی چھ ماہ بنتے ہیں اور یہی حمل کی کم از کم مدت قرار پاتی ہے۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ بعض اہل علم کے نزدیک ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ (البقرۃ:۲۲۲) اور ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾(المائدۃ:۶) میں تطہر یعنی پاکیزگی حاصل کرنے سے مراد غسل ہے' اور یہ نتیجہ سورۃ النساء کی اس آیت سے نکالا گیا ہیکہ ﴿وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا﴾ (النساء:۴۳)۔

حاصل بحث اور دونوں اقوال میں تطبیق

احکام کی آیات کے عدد کے بارے میں مندرجہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک ان کی تعداد متعین نہیں' بلکہ تمام آیات سے احکام مستنبط ہوتے ہیں' جبکہ ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ ایسی آیات ایک مخصوص عدد میں محصور ہیں۔

بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ اختلاف تضاد کے بجائے تنوع پر مبنی نظر آتا ہے۔ اگر اس کی یہ توجیہہ کر لی جائے کہ جن علماء نے ''آیاتِ احکام'' کو باقاعدہ شمار کیا ہے اس سے ان کی مراد صرف وہی آیات ہوں جن میں صراحت سے 'احکام' کا تذکرہ کیا گیا ہے اور دوسرے نقطۂ نظر کو اس امر پر محمول کیا جائے کہ دیگر

آیات سے بھی احکام اخذ کیے جا سکتے ہیں' لہٰذا اس اعتبار سے ان کی تعداد متعین نہیں۔ علامہ زرکشی نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے' لکھتے ہیں:

ولعل مرادهم المصرح به فان آيات القصص والامثال وغيرها يستنبط فيها كثير من الاحكام (۳۹)

''شاید ان علماء کی مراد وہ آیات ہوں جن میں احکام کی تصریح موجود ہے' اس لیے کہ قصص اور امثال پر مبنی آیات سے بھی بہت سے احکام کا استنباط ہوتا ہے''۔

تفسیر آیات الاحکام کا ارتقاء

عہد نبویؐ

تفسیر فقہی کا آغاز صدرِ اسلام ہی سے ہو گیا تھا اور یہ قرآن مجید کی نبوی تفسیر ہی کا ایک حصہ تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ پر جب قرآنی آیات نازل ہوتیں تو آپؐ ان کی وضاحت فرماتے۔ احکام کی آیتیں بھی انہی میں شامل تھیں۔ رسول اکرم ﷺ ان کی تشریح وتوضیح اپنے قول سے بھی فرماتے اور عمل سے بھی۔ ان میں جو آیات مجمل ہوتیں آپؐ ان کی تفصیل بیان فرماتے' ان کے اطلاق کی تقیید اور عموم کی تخصیص فرماتے۔ مثلاً: (۱) قرآن مجید میں اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا گیا تو آپؐ نے اس کی تعمیل میں صحابہؓ کو نماز پڑھائی اور فرمایا: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ)) (۴۰) یعنی ''نماز اس طرح پڑھو جیسے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔ (۲) اسی طرح حج کی آیات کی تفسیر اپنے اقوال وارشادات سے بھی فرمائی اور صحابہ کرامؓ سے فرمایا: ((خُذُوْا مَنَاسِكَكُمْ)) (۴۱) یعنی ''اپنے حج کا طریقہ سیکھ لو''۔ اور عملاً حج کر کے بھی دکھایا۔ (۳) قرآن مجید میں زکوٰۃ کا حکم اجمالی طور پر موجود ہے' جیسے: ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (البقرۃ: ۱۱۰) اور: ﴿وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (الانعام: ۱۴۱) اور: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (البقرۃ: ۲۶۷) اب زکوٰۃ کس چیز میں واجب ہے' اس کا نصاب کیا ہے' اس کی ادائیگی کے اوقات کیا ہیں' ان سب کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے ان آیات کی تبیین فرماتے ہوئے ان تمام سوالوں کا جواب دیا۔ اسی طرح دیگر احکام ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں حضرات صحابہ کرام j اس نوعیت کی آیات کے بارے میں خصوصیت سے سوال کیا کرتے تھے اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ سیدنا عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں:

سالتُ رسولَ اللّٰه ﷺ عَنِ الْكَلالَةِ . فَقَالَ : ((تَكْفِيْكَ آيَةُ الصَّيْفِ)) (۴۲)

''میں نے رسول معظم ﷺ سے کلالہ کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: تجھے آیۃ الصیف (۴۳) کافی ہے''۔

عہد صحابہ وتابعینؒ

حضور نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام j نے ''آیات الاحکام'' میں موجود دیگر دلالتوں میں اجتہاد کا آغاز کیا' جن کے بارے میں وہ رسول اکرم ﷺ سے دریافت نہ کر سکے تھے اور نہ ہی اس سلسلے میں ان کے پاس کوئی علم پہلے سے موجود تھا۔ اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں:

(۱) سیدنا ابوبکر h کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے سورۃ النساء کی آیت ۱۲ ﴿وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً﴾ کی تفسیر اجتہاد سے کی اور فرمایا:

قد رأيتُ في الكلالة رأيًا ' فان كان صوابًا فمن اللّٰه وحده لا شريک له' وان يک خطأ فمني ومن الشيطان' واللّٰه بريء منه ' ان الكلالة ما خلا الولد والوالد[٤٤]

''میں نے کلالہ کے بارے میں ایک رائے اختیار کی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو خدائے وحدہٗ لاشریک کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی جانب سے ہے' اللہ تعالیٰ اس سے بری ہے' اور وہ یہ ہے کہ کلالہ سے مراد وہ ہے جس کی نہ اولاد ہو اور نہ باپ''۔

(۲) سیدنا عمر بن خطاب h نے ایک قول کے مطابق ارشادِ باری تعالیٰ ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ﴾ (البقرۃ:۱۹۶) میں اجتہاد کرتے ہوئے حج تمتع سے منع کیا' لیکن کبار صحابہ' سیدنا علیؓ' سیدنا ابن مسعودؓ' سیدنا ابوموسیٰؓ اور سیدنا ابن عمر j نے ان کی مخالفت کی۔[٤٥]

علاوہ ازیں اس سلسلے میں نمایاں ترین صحابہ کرام میں ابن مسعودؓ' ابن عمر اور ابن عباس j کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان حضرات نے باقاعدہ حلقہ ہائے درس کی شکل میں قرآنی مطالب کو تشنگانِ علم تک پہنچایا اور ان کے طرزِ فکر کا اثر ان کے شاگردوں میں بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ تفسیر قرآن اور خصوصاً فقہی تفسیر کے حوالے سے مختلف مدارس وجود میں آئے۔ تلامذۂ ابن مسعودؓ نے مدرسۂ کوفہ کی بنیاد رکھی' فیض یافتگانِ ابن عمرؓ کے ہاتھوں مدینہ کا مکتب تشکیل پایا اور ترجمان القرآن سیدنا ابن عباسؓ کے لائق شاگردوں نے مکہ مکرمہ میں حلقۂ تفسیر قرآن قائم کیا۔[٤٦]

عہد تدوین

صحابہ کرام j اور ان کے شاگرد تابعینؒ کے دور میں ''تفسیر آیات الاحکام'' پر توجہ تو دی جاتی تھی لیکن اس کا دائرہ افتاء وتدریس کے میدان تک ہی محدود تھا اور تحریری شکل میں کوئی باقاعدہ تفسیر موجود نہ تھی۔ ''احکام القرآن'' پر پہلی باقاعدہ کتاب امام مقاتل بن سلیمان الخراسانیؒ (متوفی ۱۵۰ھ) نے لکھی۔ یہ تفسیر بالماثور تھی۔ البتہ مصنف نے مختلف آراء بیان کر کے ان میں ترجیح کا اسلوب اختیار کیا۔[٤٧]

آیاتِ احکام پر لکھنے والے ائمہ مجتہدین میں سے ایک مجتہد امام یحییٰ بن زکریا بن سلیمان القرشی

الکوفیؒ (متوفی ۲۰۳) بھی ہیں۔[۴۸] بعدازاں معروف مذاہب کے ائمہ اوران کے تلامذہؒ نے اس سلسلے میں کتابیں لکھیں، جن کا ذکر سطورِ ذیل میں کیا جارہا ہے۔

مذہب شافعی

☆ ان میں سب سے مشہوراوراوّلین مصنف امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس الشافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) ہیں، جنھوں نے ''احکام القرآن'' پر مستقل کتاب لکھی، لیکن یہ دستیاب نہیں۔ان کی ایک کتاب اسی نام سے شائع ہوچکی ہے، جسے مشہور محدث اور ''السنن الکبریٰ'' کے مؤلف امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقیؒ نے جمع کیا ہے۔علامہ زاہدالکوثریؒ نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ کی اپنی تصنیف کردہ کتاب ''احکام القرآن'' کی ہمیں اطلاع نہیں ہوسکی، لیکن ان کی مختلف کتابوں سے امام بیہقی نے ایک مستقل کتاب مرتب کی ہے۔[۴۹] واللہ اعلم!

☆ شافعی فقہ کے اسلوب پر ایک تفسیر امام الکیاالہراسیؒ نے بھی ''احکام القرآن'' کے نام سے لکھی ہے۔ موصوف امام غزالیؒ کے رفیق تھے۔ اپنی کتاب کے مقدمہ میں مقصدِ تالیف 'امام شافعی کے استدلالات کی شرح' بتاتے ہیں۔ان کا منہج یہ ہے کہ امام شافعی کے دلائل جمع کرتے ہیں اورانہی کے طریق پر چلتے ہوئے مزید دلائل کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔[۵۰]

امام الکیاالہراسیؒ اورامام بیہقیؒ کی کتابوں کے اسلوب میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر کی کتاب مستقل طور پران کی اپنی تصنیف ہے، جبکہ مؤخرالذکر نے محض امام شافعیؒ کے استدلالات جوکہ متفرق تھے، یکجا کر دیے ہیں اوران پرکوئی اضافہ نہیں کیا۔

مذہب اہل عراق

احکامی آیات پراہل عراق کے زاویۂ نگاہ سے لکھی گئی کتب میں درج ذیل قابل ذکر ہیں:

☆ ''احکام القرآن''۔ یہ امام علی بن موسیٰ بن بزدادالقمی کی تحریر کردہ ہے۔

☆ ایک ہزارصفحات پرمشتمل امام ابوجعفرالطحاویؒ کی ''احکام القرآن''۔امام طحاوی عمومی طور پر، قطع نظر ان کے اسلوب ترجیح سے، محدثین کے منہج پر چلتے ہیں۔

☆ امام ابوبکراحمد بن علی الرازیؒ (المعروف بالجصاص) کی کتاب ''احکام القرآن'' جوکہ بہت مشہور و معروف ہے، یہ تین جلدوں پرمشتمل ہے۔کتاب انتہائی قابل قدر ہے، لیکن اپنے مذہب کوترجیح دینے کی کوشش کی گئی ہے، خواہ بعیدتاویل ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔اس کا اردوترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے۔

☆ ''تلخیص احکام القرآن''، جس کے مؤلف الجمال بن السراج محمود بن احمد القونویؒ ہیں۔

☆ سرزمین ہند کے شہرۂ آفاق اصولی اورفقیہہ ملاجیونؒ کی ''التفسیرات الاحمدیہ'' بھی آیات الاحکام ہی

کی تفسیر پر مشتمل ہے۔کتاب مختصر ہونے کے باوجود انتہائی مفید ہے۔(۵۱)

مذہب اہل مدینہ

جن تفاسیر میں اہل مدینہ کے اسلوبِ فکر کو ملحوظ رکھا گیا ہے‘ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

☆ مالکیۂ بصرہ کے معتبر عالم امام اسماعیل القاضیؒ کی کتاب ’’احکام القرآن‘‘۔امام الجصاصؒ نے اس پر تنقید بھی کی ہے۔

☆ اسماعیل قاضیؒ کی اسی کتاب کا اختصار بکر بن العلاء القشیریؒ نے ’’مختصر احکام القرآن‘‘ کے نام سے کیا ہے۔

☆ علاوہ ازیں ’’احکام القرآن‘‘ ہی کے نام سے ابن بکیرؒ ‘ابن العربیؒ اور ابن فرسؒ نے بھی مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ان میں سے علامہ ابن العربیؒ کی کتاب انتہائی مقبول ومعروف ہے۔ (۵۲)

آیات الاحکام پر متأخرین کی کتب

متأخرین میں اس موضوع پر دو کتابیں خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں‘جن سے احکام القرآن کا کوئی طالب علم مستغنی نہیں ہوسکتا۔فخر المتأخرین علامہ صدیق حسن خان القنوجی البخاریؒ کی کتاب ’’نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام‘‘ اور علامہ محمد علی الصابونی کی ’’روائع البیان تفسیر آیات الاحکام فی القرآن‘‘۔

اول الذکر تفسیر میں فاضل مفسرؒ نے اپنے اندازے کے مطابق تمام آیاتِ احکام کی تفسیر کی ہے اور اختصار و جامعیت کو ملحوظ رکھا ہے۔اپنے موضوع پر انتہائی مفید اور قابل قدر کتاب ہے۔اس کا اردو ترجمہ ہمارے شیخ محترم حافظ محمد الیاس اثری حفظہ اللہ نے کیا ہے جو شائع ہو کر دستیاب ہے۔

علامہ الصابونی کی کتاب جدید اسلوب پر لکھی گئی ہے۔یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے‘اس میں تقابلی انداز اختیار کیا گیا ہے اور تمام ائمہؒ کے نقطہ ہائے نظر اور ان کے دلائل ذکر کیے گئے ہیں۔مؤلف کتاب کی تفسیر‘ فقہ اور دیگر موضوعات پر تیس سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں جس سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

فقہی اسلوب پر قرآن کی مکمل تفاسیر

اوپر جن تفاسیر کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف احکامی آیات ہی کی تفسیر پر مشتمل ہیں اور ان میں دیگر آیات کی تفسیر نہیں کی گئی۔لیکن کئی ایسی تفسیریں بھی ہیں جن میں مکمل قرآن مجید کی تفسیر کی گئی ہے‘البتہ ’’آیات الاحکام‘‘ پر خصوصی توجہ دی گئی ہے‘اس لیے ان کا شمار فقہی تفاسیر میں ہوتا ہے۔ان میں سے ایک شہرۂ آفاق تفسیر علامہ القرطبیؒ کی ’’**الجامع لاحکام القرآن**‘‘ ہے جو کہ تفسیر القرطبی کے نام سے مشہور ہے۔اس تفسیر کو اہل علم کے ہاں مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔

☆ علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی ’’تفسیر مظہری‘‘ بھی انہی تفاسیر میں شامل ہے۔یہ تفسیر بھی برصغیر

کے اہل علم کے ہاں انتہائی مقبول و متداول ہے۔ اصل کتاب فارسی میں تھی لیکن اب اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، جس سے اردو دان طبقہ بھی مستفید ہو سکتا ہے۔

علم ''آیاتُ الاحکام'' کی اہمیت

قرآن مجید کی احکام پر مبنی آیات کا علم حاصل کرنا انتہائی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ احکامِ الٰہی پر عمل اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کا علم ہوگا۔ اس پہلو سے ایک عام آدمی کو بھی چاہیے کہ وہ بطورِ خاص ان آیات کو سمجھنے کی کوشش کرے جن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، نکاح، طلاق جیسے مسائل کا ذکر ہے کہ یہ روزمرہ میں ہر شخص کو پیش آتے ہیں۔

☆ 'آیات الاحکام' ایک دوسرے اعتبار سے بھی بہت اہم ہیں، اور وہ یہ ہے کہ علماء نے اس کا ذکر اجتہاد کی اوّلین شرائط میں کیا ہے۔ جب تک 'آیات الاحکام' سے واقفیت نہ ہو کوئی شخص اجتہاد کا اہل نہیں ہو سکتا۔

● الشیخ محمد الخضری بکؒ شرائطِ اجتہاد کے تحت لکھتے ہیں:

فالكتاب هو الاصل ولا بد من معرفته ، ولا يلزم لصحة الاجتهاد معرفته كله بل ما يتعلق باحكام الافعال منه (۵۳)

''قرآن مجید تو اصل بنیاد ہے اس لیے اس کی معرفت انتہائی ضروری ہے۔ لیکن اجتہاد کے لیے مکمل قرآن کا علم لازم نہیں بلکہ احکام سے متعلقہ حصے کی واقفیت ہی کافی ہے''۔

● مشہور مصری عالم علامہ محمد ابوزہرہؒ کہتے ہیں:

انه يجب ان يكون عالماً بدقائق آيات الاحكام فى القرآن(۵۴)

''مجتہد کے لیے لازم ہے کہ وہ قرآن کی آیاتِ احکام کی گہرائی سے واقفیت رکھتا ہو''۔

● علامہ حافظ محمد بن فضل الدین محدث گوندلویؒ فرماتے ہیں:

الاول: ان يكون عالما منصوص الكتاب والسنة' فان قصر فى احدهما لم يكن مجتهدا ولا يجوز له الاجتهاد ولا يشترط معرفته بجميع الكتاب والسنة بل بما يتعلق منهما بالاحكام(۵۵)

''اجتہاد کی پہلی شرط یہ ہے کہ کتاب وسنت کی نصوص کا علم ہو۔ اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی علم نہ ہوا تو وہ مجتہد نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے لیے اجتہاد جائز ہے۔ اس باب میں کتاب وسنت کی تمام نصوص کا علم ضروری نہیں بلکہ صرف احکام سے متعلقہ آیات واحادیث کی معرفت ہی کافی ہے''۔

● 'اصول الفقہ الاسلامی' میں ہے:

الاول ان يعرف الشخص معانى آيات الآحكام المذكورة فى القرآن الكريم لغة

وشرعًا (٥٦)

''اجتہاد کی پہلی شرط یہ ہے کہ مجتہد قرآن مجید کی احکامی آیات کے لغوی وشرعی مفہوم سے باخبر ہو''۔

● صاحب 'الوجیز' لکھتے ہیں:

ومن شروط الاجتهاد التى تلزم المجتهد معرفة الكتاب ' اذ هو اصل الاصول ومرجع كل دليل ' فلا بد للمجتهد ان يعرف آياته جميعا معرفة اجمالية ' ويعرف آيات الاحكام فيه معرفة تفضيلية لان من هذه الآيات تستنبط الاحكام الشرعية العملية(٥٧)

''ایک مجتہد کے لیے اجتہاد کی لازمی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کی معرفت رکھتا ہو کہ یہ اصل الاصول اور ہر دلیل کا مرجع ہے۔ لہٰذا مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کی تمام آیات کی اجمالی واقفیت اور آیات الاحکام کا تفصیلی علم رکھتا ہو' کیونکہ انہی آیات سے شریعت کے عملی احکام اخذ ہوتے ہیں''۔

● علامہ محمد بن صالح العثیمینؒ شرائطِ اجتہاد بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

للاجتهاد شروط منها: ١۔ ان يعلم من الادلة الشرعية ما يحتاج اليه فى اجتهاده كآيات الاحكام واحاديثها(٥٨)

''اجتہاد کی کچھ شرائط ہیں' ان میں سے پہلی یہ ہے کہ وہ ان شرعی دلائل سے واقف ہو جن کی اجتہاد میں ضرورت ہے' مثلاً احکام سے متعلقہ آیات اور احادیث''۔

● قرآن مجید کی احکامی آیات کی اسی اہمیت کے پیش نظر حجۃ الہند حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قرآن کریم کے علومِ پنجگانہ میں اسے سرفہرست رکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

ليعلم ان معانى القرآن المنطوقة لا تخرج عن خمسة علوم

''جاننا چاہیے کہ قرآن مجید کے بیان کردہ معانی پانچ علوم سے باہر نہیں''۔

بعدازاں علم الاحکام کا ذکر کر کے لکھا ہے:

وتفصيل هذا العلم منوط بذمة الفقه(٥٩)

''اس علم کی تفصیل بیان کرنا فقیہہ کی ذمہ داری ہے''۔

اہل علم کے مندرجہ بالا اقوال وارشادات سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ''علم آیات الاحکام'' کا سیکھنا فقہ واجتہاد کی لازمی شرط اور ایک فقیہہ اور مجتہد کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ اسی طرح عام لوگوں کو بھی اس سے باخبر ہونا چاہیے تاکہ وہ احکامِ الٰہی پر کما حقہ عمل پیرا ہو سکیں۔

حواشی

(١) احمد بن عبد الحليم ابن تيميه' مقدمة اصول التفسير' فصل فى النبى ﷺ بين لاصحابه معانى القرآن۔

(٢) مشكوٰة المصابيح، كتاب الاعتصام، بحواله سنن ابی داؤد والدارمی ومسند احمد وغیره۔
(٣) ابوداؤد السجستانی، المراسیل: ٢٤٩/٢۔ (روایت صحیح ہے)
(٤) صحیح الجامع للالبانیؒ، ح ٢٩٣٧۔
(٥) الدارمی، السنن: ١٤٥/١۔
(٦) الخطیب البغدادی، الکفایة فی علم الروایة، ص ١٦۔
(٧) الدارمی، السنن: ١٤٥/١۔
(٨) ابن تیمیه، مقدمة اصول التفسیر، فصل فی تفسیر القرآن بالقرآن و تفسیره بالسنة واقوال الصحابة۔
(٩) عماد الدین ابو الفدا اسماعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم (مقدمة): ١٩/١، ٢٠، دارالسلام، الریاض، الطبعة الثانیة ١٤١٨ھ/١٩٩٨ء۔
(١٠) ابن تیمیة، مقدمة اصول التفسیر، فصل فی اختلاف السلف فی التفسیر وانه اختلاف تنوع۔
(١١) محمد بن عیسیٰ الترمذی، الجامع، ابواب التفسیر عن رسول اللّٰہﷺ، تفسیر سورة البقرة۔
(١٢) ابوعبد اللّٰہ الحاکم، معرفة علوم الحدیث۔
(١٣) شاه ولی اللّٰہ الدهلویؒ، الفوز الکبیر۔
(١٤) ابن تیمیةؒ، مجموع الفتاویٰ: ٣٦٤/١٥۔
(١٥) مسند احمد، ح ١٦٥٩٢۔
(١٦) ابن تیمیةؒ، مقدمة اصول التفسیر۔
(١٧) بحوالہ قرآن فہمی کے اصول، مرتبہ حافظ حسن مدنی
(١٨) ابن جریر الطبری، مقدمۂ تفسیر جامع البیان۔
(١٩) محمد بن اسماعیل البخاریؒ، الجامع الصحیح، کتاب التفسیر۔ نیز کتاب الایمان، باب ظلم دون ظلم۔ نیز کتاب الانبیاء، باب قول اللّٰہ تعالی: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾.
(٢٠) ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، السنن، ابواب فضائل القرآن عن رسول اللّٰہﷺ، باب ما جاء فی فضل القرآن، ح ٢٨٣١۔
(٢١) ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، السنن، ابواب تفسیر القرآن عن رسول اللّٰہﷺ، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برأیه۔ ح ٢٨٧٥۔
(٢٢) ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، السنن، ابواب التفسیر عن رسول اللّٰہﷺ، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برأیه۔ح ٢٨٧٤۔
(٢٣) سلیمان بن اشعث السجستانی، سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب الکلام فی کتاب اللّٰہ بغیر علم، ح٣٦٥٢۔ نیز سنن الترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللّٰہﷺ، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برایه، ح ٢٨٧٦۔ امام ترمذیؒ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے راوی سہیل بن حزمؒ کے بارے میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے۔ بعض صحابہؓ سے اسی طرح مروی ہے کہ انہوں نے بغیر علم کے تفسیر قرآن کرنے میں سختی کی ہے۔
(٢٤) ابن تیمیة، مقدمة اصول التفسیر، تفسیر القرآن بالرأی۔

(۲۵) یہ اور اس سلسلے کے دیگر واقعات مقدمة اصول التفسیر کی آخری فصل میں موجود ہیں۔

(۲٦) ابن تیمیة' مقدمة اصول التفسیر' ص ۸۲'۸۳۔

(۲۷) (ا) الدکتور علی بن سلیمان العبید' تفاسیر آیات الاحکام و مناهجها: ۲۵/۱۔ (ب) الدکتور فهد العندس' آیات الأحکام فی المغنی: ۲۲/۱۔

(۲۸) ایضاً۔

(۲۹) امام غزالیؒ نے المستصفی (٦/٤) میں' امام رازیؒ نے المحصول (۳۳/۲) میں اور علامہ الماوردیؒ نے ادب القاضی (۱۸۲/۱) میں اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔

(۳۰) محمد صدیق حسن خان القنوجی البخاری' نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام' ص ۱۔ نعمانی کتب خانہ' لاہور۔

(۳۱) التقریر والتحبیر: ۳۹۰/۳۔

(۳۲) دیکھئے شرح التنقیح (ص٤۳۷)' شرح مختصر الروضة: (٤۱۵/۳)' البرهان فی علوم القرآن (٦/۲۔٤)' الاتقان: (۱۸۵/۲)' شرح الکوکب المنیر: (٤٦۰/٤)' تقریب الوصول: ص ٤۳۱۔ارشاد الفحول (۸۱٤/۲) طبع/صبحی حلاق' نثر الودود (۱٤۵/۲)'

(۳۳) الامام الحافظ عز الدین بن عبدالسلام السلمی (المتوفی ٦۰۰) کی کتاب کا نام 'الامام فی بیان ادلة الاحکام' ہے۔ عظیم اور قابل قدر کتاب ہے' جس سے فقہ کا کوئی طالب علم مستغنی ہوسکتا ہے اور نہ ایک فقیہہ اور عالم۔

(۳٤) شرح مختصر الروضة : ٤۱۵/۳۔

(۳۵) شرح التنقیح' ص ٤۷٦۔

(۳٦) الزرکشی' البرهان' ۷/۲۔۵۔

(۳۷) سیدنا عمر h کے پاس ایک عورت لائی گئی جس نے چھ ماہ بعد بچے کو جنم دیا تھا تو آپؓ نے اسے رجم کرنے کا ارادہ کیا۔ سیدنا علی h کو علم ہوا تو فرمایا: اسے رجم نہیں کیا جا سکتا۔ سیدنا عمر h کو پتا چلا تو آپؓ نے سیدنا علیؓ سے اس کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ قرآن میں ہے: ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ (البقرة:۲۳۳) یعنی مائیں دو سال اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔ اور دوسرے مقام پر ہے: ﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ (الاحقاف:۱۵) یعنی دودھ چھڑانے اور حمل کی کل مدت ۳۰ ماہ ہے۔ اس میں سے دو سال نکل گئے جو مدت رضاعت ہے تو باقی چھ ماہ رہ جاتے ہیں' یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوسکتا ہے۔ (سنن الکبریٰ للبیهقی' باب ما جاء فی اقل الحمل' ح۱۵۳۲٦'۱۵۳۲۷)

(۳۸) امام بیہقی اپنی سنن کبریٰ میں باب ما جاء فی اقل الحمل' ح۱۵۳۲۵ کے تحت روایت کرتے ہیں کہ ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ جب عورت نو ماہ کے بعد بچہ جنے تو ۲۱ ماہ دودھ پلانا اس کے لیے کافی ہے۔ اور اگر ۷ ماہ بعد جنے تو ۲۳ ماہ اور ٦ ماہ بعد جنے تو ۲۴ ماہ دودھ پلانا کافی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾۔

(٣٩) البرهان، ٢/٤۔٣۔

(٤٠)محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة......

(٤١) ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب النسائی، السنن، کتاب المناسك، باب الرکوب الی الجماء واستظلال المحرم، ح، ٣٠١٢۔

(٤٢) رواه احمد فی المسند، ح ٢٦٢ من حدیث عمر بن الخطابؓ۔

(٤٣) آیة الصیف سے *مراد سورۃ النساء کی آخری آیت ہے جس میں کلالہ کا ذکر ہے۔ اسے* "آیة الصیف" *اس لیے کہتے ہیں کہ یہ گرمی کے موسم (فصل صیف) میں نازل ہوئی۔ دیکھئے تفسیر القرآن العظیم از امام ابن کثیر، مذکورہ آیت کی تفسیر۔*

(٤٤) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ٦١١/١ تفسیر آیت مذکورہ، دار السلام، الریاض۔

(٤٥) تفسیر ابن کثیر، *مذکورہ آیت کی تفسیر۔*

(٤٦) الخضیری، تفسیر التابعین، ٦٦٥/٢۔

(٤٧) تفسیر الخمس مائة آیة فی القرآن لمقاتل بن سلیمان، ص ٦٦، ٦٨۔

(٤٨) *اس کا ذکر ابن الندیمؒ نے الفہرست (ص ۵۷) اور الداودی نے 'طبقات المفسرین' (۳۶۲/۲) میں کیا ہے۔*

(٤٩) دیکھئے احکام القرآن للشافعیؒ، ص ١٤۔ دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان ١٩٧٥ء (مقدمه)

(٥٠) الکیا الهراسی، احکام القرآن، ١/٢۔

(٥١) *حاشیہ نمبر ۴۹۔*

(٥٢) ایضاً۔

(٥٣) محمد الخضری بکؒ، اصول الفقه، ص ٤٠٥، طبع چهارم، ١٩٦٢ء، مطبعة السعادة۔

(٥٤) محمد ابوزهره، اصول الفقه، ص ٣٥٨، دارالفکر العربی۔

(٥٥) الحافظ محمد گوندلویؒ، بغیة الفحول فی شرح مختصر الاصول، ص ١٣٠۔

(٥٦) ڈاکٹر وهبه الزحیلی، اصول الفقه الاسلامی، ص ١٠٤٤، دارالفکر۔

(٥٧) الدکتور عبدالکریم زیدان، الوجیز فی اصول الفقه، ص٤٠٣، *فاران اکیڈمی لاہور۔*

(٥٨) محمد صالح العثیمینؒ، الاصول من علم الاصول، ص ١١٩۔ طبع دوم، ١٩٩٤ء دارالجیل بیروت، لبنان۔

(٥٩) الشاه ولی الله الدهلویؒ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، الباب الاول فی العلوم الخمسة التی بینهما القرآن العظیم بطریق التنصیص۔

❁❁❁